© rasailojaraid.com

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک شاگرد

مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رامپوری

(عہد شخصیت اور علمی خدمات)

۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء ——— ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۸ء

از: ڈاکٹر ماجد علی خاں، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ جل شانہ' نے اس عالم میں موت وحیات کا رشتہ ایک ایسا رشتہ بنایا ہے جس سے ادنیٰ و اعلیٰ کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ چاہے وہ انبیاء جیسے مقرب بارگاہ ہوں یا فرعون، ہامان و شداد جیسے مغضوب و ضال ہوں سب کو موت کی آغوش میں بالآخر جانا ہی ہوتا ہے اور اس کے ذائقہ کو چکھنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ (ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔) باقی رہنے والی صرف خداوند قدوس کی ذات ہے اس کے علاوہ ہر شے پر ازل سے ہی فنا کے لفظ کو ثبت کر دیا گیا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

اس کے باوجود کچھ اموات ایسی ہوتی ہیں جن کو اس فانی دُنیا میں موت سمجھا جاتا ہے لیکن اللہ کے یہاں وہ حیات شمار کی جاتی ہیں: وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (البقرۃ: ۱۵۴) ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جاتے ہیں اُن کی نسبت یوں بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مت کہو کہ وہ (معمولی مُردوں کی طرح) مردے ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں لیکن تم (ان حواس سے اس حیات کا) ادراک نہیں کرسکتے۔ اسی مفہوم میں عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے:

موت التقی حیات لا نفاد لھا
قد مات قوم وھم فی الناس احیاء

(ترجمہ) متقی اور پرہیز گار کی موت غیر فانی زندگی ہے۔ یہ لوگ بظاہر مر چکے ہیں حالانکہ عالم انسانیت میں دراصل زندہ یہی ہیں۔

حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی چند ہستیوں میں سے ایک تھے جو بظاہر تو اس عالم فانی سے گزر چکے ہیں لیکن ان کے

کارنامے اب بھی زندہ جاوید ہیں اور عالم انسانیت میں یہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آپ کی پیدائش رامپور میں ۴ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۸۹۹ء ہوئی اور وفات ۲۷ شوال ۱۴۰۱ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۸۱ء بروز جمعرات ہوئی۔

حضرت مولاناؒ کا تعلق پٹھان قوم سے تھا۔ حسن اتفاق کہیے یا قسمت کی ستم ظریفی راقم السطور کا تعلق بھی اسی قوم سے ہے۔ میرے ان دو متضاد الفاظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم میں بعض خصائص متضاد ہوتے ہیں۔ جہاں پٹھان اپنی جرأت، خودداری، دلیری، بہادری، اعلیٰ ظرفی اور ریات کی پختگی کے لیے مشہور ہیں اور ان کے اندر یہ صفات ملتی ہیں وہاں اگر اس قوم کا جلا نہ ہوا ہو اور اصلاح کی منازل تک اس کی رسائی نہ ہو سکے تو پھر یہ غضب اور شہوت میں ڈوب کر انسانی حدود کو پار کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتی۔ جس کی مثال موجودہ دور میں کراچی کے سیجون وپہاجر فسادات اور رامپور شہر میں آئیسی قتل و غارت ہے اور ماضی میں پٹھان ریاستوں کے حکمرانوں و امراء کا ظلم و تشدد اور نادر شاہ کا دہلی میں قتل عام ہے۔

[redacted]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ں وجہ سے ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ ایک صاحب نے ایک پٹھان سے کہا
یہاں پٹھانوں میں کوئی پیغمبر ہی نہیں ہوا۔ یہ پٹھان صاحب نے جلا کر جواب دیا
تم جھوٹ بولتے ہو کیا (حضرت) عیسیٰ خاں اور (حضرت) موسیٰ خاں کا نام نہیں سنا؟
اصل یہ اسلام کی خوبی ہے کہ ان متضاد صفات کی حامل قوم بھی اس کے دامن سے
وابستہ ہو کر حضرت سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ اور فیض
تر سے مستفیض ہوئی۔

رامپور ایک ایسا شہر ہے جس کی گود میں سیکڑوں صاحب علم شخصیتوں، شعراء،
اولیاء، صوفیا اور علماء نے پرورش پائی اور اس کے آب و گل سے استفادہ کیا۔ اسی
زمین کے بطن سے مولانا محمد علی اور شوکت علی جیسے جلیل القدر مجاہدین آزادی
پیدا۔ اگر رامپور کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالی جائے تو ایسی اعلیٰ شخصیتیں کم ہی ملیں گی۔
جنھوں نے اس شہر کے دو تاریخی دوروں کو اچھی طرح دیکھا اور پرکھا ہو اور اپنی زندگی
کے بڑے حصّوں کو دونوں دوروں میں گزارہ ہو۔ ایسے علماء میں اگر حضرت مولانا
امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا نام لیا جائے تو بیجا نہیں ہوگا۔ حضرت مولانا
نجیب الدین احمد خاں صاحب کا شمار نہ صرف ایسے علماء میں کیا جاتا ہے بلکہ
ایسے صوفیاء میں بھی جنھوں نے اپنی زندگی کے بڑے حصّوں کو رامپور کے دو اہم تاریخی
ادوار میں گزارا ہو۔ میری مراد رامپور کے ایک اُس دور سے ہے جو اس کا ریاستی
دور تھا اور دوسرے اُس دور سے ہے جو ۱۹۴۷ء کی آزادی ہند کے بعد کا ہے پھر
جس کو کہا جائے کہ سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد کا دور ہے جب کہ ریاست کا خاتمہ ہوا اور رامپور
ہندوستان کے نقشہ میں ایک ڈسٹرکٹ یا ضلع کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔

حضرت مولانا کے علمی و دیگر کارناموں پر روشنی ڈالنے سے قبل میں مناسب سمجھتا ہوں
کہ اس شہر کے ان دو دوروں کے متعلق بھی سرسری طور پر کچھ نہ کچھ لکھ دیا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رامپور کا ریاستی دور:

رامپور کا ریاستی دور جہاں ایک طرف شاہی دبدبہ اور پٹھانی شان و شوکت کا دور تھا تو وہاں یہ دور درباری خوشامد اور جی حضوری کا بھی دور تھا۔ ویسے عام طور پر رامپور کو ایسے حکمراں ملے جنھوں نے علماء اور مذہبی پیشواؤں کی قدر و منزلت کی۔ ریاست میں ایک اعلیٰ دینی ادارہ، مدرسہ عالیہ بھی قائم کیا گیا جس کی شہرت اندرون ملک سے نکل کر بیرون ہند تک پھیل گئی۔ بڑے بڑے علماء اس کی مسند درس پر بیٹھنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ مدرسہ عالیہ کے تمام اخراجات ریاست کی طرف سے ہی پورے ہوتے تھے۔ بعد ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور میں کافی بڑی تعداد میں اہل علم و حرفہ آگئے تھے۔ یہاں کے نوابین ان کی امداد بڑی فراخدلی سے کرتے تھے۔ اس ریاست نے ایسے حکمرانوں کو جنم دیا جنھوں نے غالبؔ، داغؔ، امیر مینائیؔ جیسے شعراء اور حکیم اجمل خاں صاحب جیسے اطباء، اور اہلِ علم کی مہمان نوازی کی۔ البتہ یہ دور جاگیردارانہ نظام پر قائم تھا۔ اگر اس دور میں نوابین کی نظرِ عنایت سے راتوں رات ایک غریب و بے آسرا شخص جاگیردار، زمیندار یا مستاجر بن جاتا تھا تو ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر شہر کے بڑے بڑے اور چنیدہ مستاجروں سے گاؤں کو ضبط کر کے روٹیوں کا محتاج بھی کر دیا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ افراد کی ترقی و تنزلی حکمرانوں کی اشارۂ چشم و ابرو کی مرہونِ منت تھی۔ اصلاحی و علمی اور ٹھوس کام کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بعض وہ علماء، اُدبا، اور اہلِ حرفہ جو ان باتوں کو جھیل نہ سکتے تھے۔ ریاستوں کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جا بسے تھے۔

رامپور کے ریاستی دور کی بعض اہم خصوصیات بھی ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہاں پر اس دور میں بے روزگاری عام طور پر نہیں تھی۔ لوگ نسبتاً خوشحال تھے۔ نوابین نے رامپور میں بہترین عمارات بنوا کر اس کو مغربی یو پی کا ایک منفرد شہر بنا دیا تھا۔ نواب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حامد علی خاں صاحب کا بنوایا ہوا قلعہ اور اس کے اندر کی حامد منزل نیز دوسری عمارات اسلامی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسی طرح نواب رضا علی خاں صاحب کے دور میں بھی کثیر تعداد میں عمارتیں بنیں، سڑکیں چوڑی ہوئیں، شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا۔ اس شہر کے باغات لکھنؤ کے باغات کے ہم پلہ تھے۔ خسرو باغ اور بے نظیر باغ کے درمیان کی سڑک جس کو عام طور پر ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا، کی مثال دور دور تک ملنا مشکل تھی۔ نواب رضا علی صاحب نے آزادیٔ ہند سے قبل رامپور میں اتنے کارخانے قائم کروا دیے تھے کہ یہ شہر چھوٹا سا کانپور کہلایا جانے لگا۔ یہ ان کی دور بینی کی اہم مثال ہے۔ اگر وہ تمام کارخانے آج بھی اسی طرح قائم رہتے تو یہ شہر انڈسٹریز میں یو۔ پی کے بہت سے صنعتی شہروں سے آگے ہوتا۔

اگر نواب حامد علی خاں صاحب رامپور کے اکبر تھے تو نواب رضا علی خاں صاحب کو رامپور کا شاہجہاں کہنا بے جا نہیں ہوگا۔ ریاستی دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ رامپور میں فیملی سسٹم پوری طرح محفوظ تھا۔ گھر اور خاندان کے بڑوں کا چھوٹے ادب و احترام کرتے اور گھریلو خاندانی روایات کو زندہ رکھتے۔ علماء کا عام طور پر احترام تھا اور صوفیاء کی توقیر و عزت کی جاتی۔

رامپور کا حال، آزادی کے بعد:

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے چند سال بعد ریاستوں کا خاتمہ ہوا اور اس میں رامپور سر فہرست رہا۔ اب رامپور ریاست کے بجائے اتر پردیش گورنمنٹ کا ایک ضلع بن گیا جس کا افسر اعلیٰ و منتظم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ضلع کلکٹر ہو گیا۔

ریاست کے خاتمہ پر سب سے برا اثر فوج اور پولیس کے ملازمین پر پڑا۔ ہزاروں کی تعداد میں ریاست کے دور کے فوجی اور پولیس والے ملازمت سے سبکدوش کر دیے گئے۔ اس کے نتیجہ میں بیروزگاری عام ہو گئی۔ جو کسر رہ گئی تھی زمینداری کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاتمہ نے اس کو بھی پورا کر دیا۔ رامپور کے زمیندار پٹھان کاشتکاری کو عیب سمجھتے تھے۔ چنانچہ زمینداری، جاگیرداری اور مستاجری کے خاتمہ سے بڑے بڑے صاحب حیثیت پٹھان روٹیوں کے محتاج ہو گئے۔ غربت اور افلاس نے ان کے دروازوں پر دستک دینا شروع کر دی. تعلیمی اعتبار سے بھی ان لوگوں کے پاس اعلیٰ ڈگریاں نہیں تھیں لہٰذا ان میں سے بہت سے لوگوں نے معمولی ملازمتوں پر گزر اوقات کرنے پر قناعت کی۔ اس طرح اس چھوٹی سی ریاست کی خوشحالی پامال کر دی گئی غربت کے نتیجے میں جرائم میں اضافہ ہوا۔

رامپور کے پٹھان مزاج کے اعتبار سے بہت گرم واقع ہوئے ہیں۔ جرائم کے اضافے میں مزاج کی اس گرمی کا بھی کافی اثر ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کے غلط تصور نے بھی لاقانونیت میں اضافہ کیا ہے۔ عام لوگ آزادی کو غیر ملکی حکومت سے آزادی کی جگہ آزادیٔ قانون (یعنی قانون سے چھٹی) تصور کرنے لگے ہیں، چنانچہ عام طور پر قانون کا احترام دل سے اٹھ گیا ہے۔ پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے بڑی حد تک خود قانون شکن بن بیٹھے ہیں۔ غرض ان تمام اسباب کی وجہ سے رامپور میں بالخصوص اور اس ملک میں بالعموم آزادی کے بعد لاقانونیت کا دور دورہ ہوا۔ اس شہر میں آپسی قتل و غارت کی جو فضا اب پیدا ہو گئی ہے یا پیدا کر دی گئی ہے اس کی مثال ہندوستان کے دوسرے شہروں میں مشکل سے ہی ملے گی۔ معمولی معمولی بات پر پستول کی گولی یا چاقو کی نوک سینے کے اندر ہوتی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بچپن میں ایک قتل محض ساڑھے دس آنے (موجودہ تقریباً ۶۵ پیسے) کے لین دین کی تکرار پر ہوا تھا۔

ریاست کے خاتمہ کے بعد اس شہر سے فیملی سسٹم کا بھی آہستہ آہستہ خاتمہ ہونا شروع ہو گیا۔ گھر اور خاندان کے بزرگوں کی عزت و احترام آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو گیا البتہ اگر کسی کے خاندان میں کوئی شرابی، جواری اور بدمعاش قسم کا آدمی ہے تو اس کا احترام محض عزت بچانے کے ڈر سے ضرور ہوتا رہا فیملی سسٹم کے خاتمہ کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ عام لوگوں نے روزگار کی خاطر باہر کا سفر کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر تیل کی دولت کی وجہ سے خلیجی ممالک میں ملازمتوں کی بوچھار نے ان خاندانوں کے ذہنوں میں احساس برتری پیدا کر دیا۔ جو غربت و افلاس میں گرفتار تھے اور "نو دولتیہ" کا ایک جدید طبقہ وجود میں آ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عزت اور احترام کی وجہ مال اور عہدہ بن گیا۔ رامپور کا مثالی معاشرہ تقریباً تباہ ہو گیا۔ جو لوگ باہر نہ جا سکے انھوں نے مقامی طور پر غیر قانونی دھندے شروع کر کے دولت بٹورنے کی ریس میں شوق و ذوق سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے جوا، سٹہ اور شراب بنانے دیجئے جیسے مخرب اخلاق کاروبار غیر قانونی طور پر محلوں میں عام ہو گئے، پولیس کی بھی جیبیں گرم ہوئیں۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے کہ عام اخلاقی سطح اور گر گئی۔

حضرت مولانا وجیہ الدینؒ کی اہم کرامت :

یہ تھے وہ حالات جن کا سابقہ حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ کو پڑا لیکن ان تمام حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مولاناؒ نے اپنے دینی، علمی اور اصلاحی مشن کو جاری رکھا۔ صوفیاء کے اندر ایک اصطلاح ہے، "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" (یعنی دین پر استقامت کرامت کے اوپر فوقیت رکھتی ہے) حضرت مولاناؒ نے رامپور کے ریاستی دور اور آزادی کے بعد کے دور، دونوں دوروں جس بے مثال استقامت سے دین کی خدمت کی ہے وہ یقیناً حضرت مولانا کی ایک اہم کرامت ہے۔ ان کی اس بے لوث خدمت کی وجہ سے دونوں دوروں میں ان کی عزت اس شہر کے اشراف و اشرار میں سے ہر فرد کے دل میں یکساں طور پر رہی۔ یہاں تک کہ علم و تقویٰ میں ان کا نام رامپور میں ضرب المثل بن گیا۔ گھروں اور خاندانوں میں ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نام کی مثالیں دی جانے لگیں۔ مجھے خود اپنا واقعہ یاد ہے کہ جب میں نے علی گڑھ میں دینیات کی تعلیمات شروع کیں تو والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ علی گڑھ میں دینیات پڑھ کر تم مولوی وجیہہ الدین صاحب تو بن نہیں جاؤ گے۔ اگر کوئی شخص بہت زیادہ عبادت اور نماز روزہ کی طرف راغب ہوتا تو لوگ کہتے کہ وہ تو مولوی وجیہہ الدین صاحب بننے کی فکر میں ہے۔ واعظین اور خطیب حضرات، حضرت مولاناؒ کے طرز پر وعظ و خطبہ کہنا اپنے لیے باعث فخر سمجھنے لگے۔ غرض حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب نے دونوں دوروں میں اپنی علمیت اور تقویٰ کا سکہ رامپور کے عوام کے دلوں پر بٹھا دیا اور اپنے وعظوں، علمی مجالس، جمعہ کے خطبوں اور درس و تدریس کے ذریعہ دونوں دوروں اس شہر کے مسلمانوں کی نیز ملک کے دور دراز علاقوں کے مسلمانوں کی اصلاح فرماتے رہے۔

شہر کے بڑے و چھوٹے، ہندو و مسلمان، امیر و غریب، حکمراں و رعایا، زمیندار و کاشتکار، سرمایہ دار اور مزدور سب کے سب مولانا کی یکساں طور پر عزت کرتے اور ان کی شخصیت کو رامپور کے لیے باعث فخر جانتے۔ میری کوتاہ نظر میں اس شہر کی مختصر تاریخ میں کوئی ایسی شخصیت بحیثیت عالم دین نہیں ابھری جس نے عوام و خواص دونوں کو اس طرح گرویدہ بنا لیا ہو جس طرح کہ حضرت مولاناؒ کے لوگ گرویدہ تھے۔

رامپور کے اس دور میں جو کہ آزادی ہند کے بعد شروع ہوا، مولاناؒ نے جس طرح رامپور کے عوام و خواص کی دینی و اخلاقی رہنمائی کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ نے اپنے مواعظ اور خطبات کے ذریعہ عوام کو احساس کمتری سے نکالا، ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی اور برائیوں سے دور کرنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ میں نے تحریر کیا ہے یہ وہ دور ہے جس میں فیملی سسٹم تک اثر انداز ہوا ہے، عام طور پر بڑوں کا احترام دلوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ اس پرفتن دور میں جب کہ الیکشنوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخالف امیدوار کی سات پشتوں تک کے حالات اگل دیے جاتے ہیں، جہاں بڑے بڑوں کی ٹوپیاں اچھالنا معمولی بات سمجھا جاتا ہے۔ مولانا نے اپنے بے مثال عمل و کردار کے ذریعہ اہلِ رامپور کے دلوں کو جیت لیا۔

اخلاق :

جو لوگ حضرت مولاناؒ سے ملتے رہے ہیں ان کو معلوم ہے کہ مولانا کے مزاج میں ایسی شگفتگی تھی جس کا ان لوگوں کو اندازہ لگانا مشکل ہے جو مولانا کے قریب نہیں آئے تھے۔ اپنے ہم عمر لوگوں کی عزت اور چھوٹوں سے محبت حضرت مولاناؒ کی مجلس کا ایک عام دستور تھا۔ اس کی وجہ سے رامپور کے عوام مولانا کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ چھوٹوں سے محبت کے ایک دو ذاتی واقعات ان سطور میں تحریر کرتا ہوں:

اپنی کسی ضرورت سے حضرت مولانا دہلی تشریف لائے۔ جمعہ کی نماز میں جامعہ ملیہ کی مسجد میں حضرت مولاناؒ کو دیکھ کر راقم السطور بہت خوش ہوا اور بعد نماز غریب خانہ پر چلنے کی درخواست کی۔ حضرت مولانا نے بہت خندہ پیشانی سے درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔ وہاں پر جامعہ کے کئی دوسرے حضرات بھی جمع ہو گئے۔ حضرت مولانا نے اُن سے کہا: ڈاکٹر صاحب میرے محلہ دار بھی ہیں۔ (یہ بات میرے لیے نئی نہیں تھی) پھر خود ہی اپنے مخصوص انداز میں تشریح کی اور فرمایا ان کے دادا اور میرے والدؒ... پڑوسی تھے اور بچپن میں میں بھی ان کے دادا کے مکان کے قریب محلہ کٹرہ جلال الدین خاں کے اُس حصہ میں رہتا تھا جو کہ اب قلعہ میں آچکا ہے۔ ہم لوگ صبح کو فجر کے بعد ٹہلنے نکل جاتے تھے جب واپس آتے تو اکثر ان کے دادا مکان کے باہری حصے میں بیٹھے ہوتے ملتے تھے اور ہم سے پوچھتے تھے۔ بچو! چائے پیو گے۔ ہم لوگ ان کی چائے کو اس وجہ سے پسند کرتے تھے کہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خالص دودھ میں پتی اور قند ڈال کر چائے بنواتے تھے اور ہمیں پلاتے تھے۔

رامپور میں جب قلعہ کی تعمیر ہوئی تو حضرت مولانا محلہ کرٹھہ سے محلہ انگوری باغ منتقل ہو گئے اور ہمارا خاندان بندریا ملا ظریف۔ لیکن وہاں پر بھی مولانا سے اس طرح نسبت رہی کہ محلہ بندریا ملا ظریف حضرت مولاناؒ کے خاندان کے ہی ایک صاحب ملا ظریف خاں صاحب کے نام پر آباد تھا۔[1]

چھوٹوں پر شفقت کے سلسلہ میں ایک دوسرا ذاتی واقعہ بھی نقل کرتا ہوں راقم السطور کی ایک بھتیجی کا نکاح حضرت مولاناؒ نے ہی پڑھایا تھا۔ راقم السطور اس میں وکیل کی حیثیت سے آیا تو حضرت مولاناؒ نے ازراہ شفقت فرمایا: "آپ ہی نکاح پڑھادیں"۔ (نوٹ: عوام کی معلومات کی غرض سے تحریر ہے کہ ولی کی طرح وکیل بھی خود نکاح پڑھا سکتا ہے) لیکن احقر نے بہت ہی ادب سے درخواست کی کہ مولانا نکاح تو آپ ہی پڑھائیں گے۔ اس کے بعد برصغیر ہند و پاک کی ایک جماعت کے سربراہ جو کہ اس وقت حیات تھے ان کی ایک تحریر کے بارے میں مولاناؒ فرمانے لگے۔ دیکھیے انھوں نے یہ لکھا ہے حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ یہ میں اس وجہ سے نقل کر رہا ہوں کہ حضرت مولانا جب کبھی بھی ان حضرات کے مسلک یا رائے کا ذکر کرتے جن کا مسلک یا رائے حضرت مولاناؒ سے مختلف ہوتا تو ان لوگوں کے نام کو بہت مناسب الفاظ میں لیتے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی رائے بھی پرزور الفاظ میں ذکر کر دیتے۔ میں نے مولانا کی زبان سے اپنے مخالفین کے لیے بھی سخت الفاظ نہیں سنے۔

---

[1] مولانا سردار شاہ خاں، حالات مشائخ، ص ۲۲۶ ؛ وجیہہ الدین احمد خاں صاحب، فیوضات وزیریہ، ص ۵۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت مولاناؒ کے اخلاق کے سلسلے میں ایک اور ذاتی واقعہ تحریر ہے۔ گو کہ یہ واقعات پرائیوٹ ہیں لیکن اُن سے مولاناؒ کے اخلاق و کردار پر روشنی پڑتی ہے اسی وجہ سے ان کو نقل کر رہا ہوں۔ راقم السطور ویسٹ انڈیز میں ملازمت کے دوران ایک مرتبہ ویسٹ انڈیز سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ بعد مغرب حضرت مولاناؒ سے ملنے کی غرض سے مدرسہ فرقانیہ حاضر ہوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت حلقۂ ذکر ہوتا ہوگا۔ معمول کے مطابق اس وقت حلقۂ ذکر ہو رہا تھا اور اس جگہ بہت ہی ہلکی روشنی تھی یا اندھیرا تھا جس میں ایک دوسرے کو دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ میں ایک کونہ میں بیٹھ گیا۔ لیکن حضرت مولاناؒ کو آہٹ محسوس ہوگئی۔ فوراً دریافت کیا، کون ہے؟ میں نے عرض کیا۔ ماجد۔ فرمایا، کیا امجد خاں صاحب کے لڑکے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ یہ سنتے ہی حلقۂ ذکر بند کروا دیا گیا۔ نیز تیز روشنی کروائی اور چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ اس طرح کے اور بھی متعدد ذاتی واقعات ہیں جن کو طول کی وجہ سے ذکر نہیں کر رہا ہوں۔

جب حضرت مولاناؒ کے یہ اخلاق اپنے چھوٹوں کے ساتھ تھے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معاملات و اخلاق کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس ماحول میں ان اخلاق کا حامل وہی شخص ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ولایت کے لیے منتخب کیا ہو۔

راست گوئی و بے باکی:

مومن کی ایک پہچان اس کی راست گوئی اور صاف گوئی ہے جب کہ منافق کی ایک پہچان اس کی کذب بیانی ہے۔ حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی راست گوئی اور صاف گوئی کے لیے مشہور تھے۔

آپ کی راست گوئی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ حضرت مولاناؒ شکار کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت شوقین تھے۔ ایک مرتبہ شکار کو تشریف لے گئے۔ ساتھ میں اور صاحبان بھی تھے۔ شیر کا شکار تھا۔ حضرت مولاناؒ موقت پر شیر کی تاک میں بیٹھ گئے۔ اتفاق سے شکاریوں میں سے (یعنی ساتھیوں میں سے) ایک صاحب ایک جھاڑی میں کسی ضرورت سے گئے ہوئے تھے۔ جھاڑیوں کی کھڑ کھڑاہٹ سے حضرت مولاناؒ سمجھے کہ جھاڑی میں شیر ہے چنانچہ بندوق داغ دی۔ گولی اُس شخص کے لگ گئی اور بعد میں انتقال کر گیا۔ یہ شکار نینی تال کے ترائی کے علاقہ میں کھیلنے گئے تھے۔ حضرت مولاناؒ پر قتل کا مقدمہ قائم ہو گیا۔ بیان کے لیے جب پیشی ہوئی تو آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ ہاں میری بندوق کی گولی ان کے لگی تھی البتہ میں نے ان کو مارنے کے ارادے سے بندوق نہیں چلائی تھی بلکہ شکار کے ارادے سے چلائی تھی۔ عدالت نے حضرت مولاناؒ کو اس راست گوئی پر بری کر دیا۔ بعد میں حضرت مولاناؒ نے ان صاحب کے خاندان کے لوگوں کو خوں بہا کے طور پر کھیتی کی زمینیں دیں۔

حضرت مولاناؒ کی بے باکی کے سلسلہ میں "حالات مشائخ" میں تحریر کردہ ایک واقعہ قابلِ توجہ ہے جس کو یہاں ہو بہو نقل کیا جاتا ہے:-

"۱۹۶۵ء میں جب کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، رامپور کے قلعہ کے میدان میں ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں شرکاء کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار بیان کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اتنا بڑا ... اجتماع غالباً رامپور کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا ہو گا۔ اس جلسہ میں ریاست کے سابق نواب رضا علی خاں اور سابق چیف منسٹر رامپور بشیر حسین زیدی بھی شریک جلسہ تھے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمان کو اس ملک کی ہندو اکثریت کے ساتھ حکومت وقت بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کا جو آپس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلق ہے وہ اسلام ہی کا نہیں بلکہ خون اور رشتے کا بھی ہے۔ اگر کسی کا باپ یہاں ہے تو کسی کا بیٹا یہاں کسی کا بھائی تو کسی کی بہن ...... (وغیرہ) ---

اب ان حالات میں اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہم اس کے دشمن ہیں تو یہ بات بھی غلط اور واقعہ کے خلاف اور منافقت بھی اور پھر کوئی دل سے ماننے کو آمادہ نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے بہت گہرا تعلق ہے ہم اس کے دوست و ہمدرد ہیں تو ہم ملک کے باغی اور غدار قرار پائیں ——— ایسے نازک اور سنگین موقع پر آپ نے جو تقریر فرمائی بس وہ آپ ہی جیسے اولوالعزم حضرات کا کام ہے مسلمانوں کی زبان سے تو بے ساختہ کلمات تحسین ادا ہو رہے تھے اور غیر مسلم بھی آپ کی حق گوئی اور قابلیت کے گن گا رہے تھے۔ آپ نے نہایت حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ہم نہ باغی ہیں اور نہ غدار اور نہ منافق۔ اسلام منافقت کو پسند نہیں کرتا۔ وطن سے محبت کی اگر اہمیت ہے تو مسلمانوں کی، اسلام اور اہل اسلام سے بھی محبت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے رہنے والے مسلمان ہوں یا ترکی کے، انڈونیشیا کے ہوں یا ملیشیا کے، مراکش کے ہوں یا عراق کے، سعودی عرب کے ہوں یا مصر کے، شام کے ہوں یا الجزائر کے تیونس کے ہوں یا اردن کے، ہم بحمداللہ تعالیٰ مسلمان ہیں اور مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف خون اور رشتہ کا یا نام کا نہیں بلکہ اسلامی کا ہے۔ سچا مسلمان کبھی منافقت کو پسند نہیں کرتا۔ ہم اسلام کے پیرو کار ہیں اور اس کے حامی و مددگار۔ اسلام حقانیت کا علمبردار ہے۔ اگر وطن سے محبت اسلام اور اسلامیت میں خلل انداز نہ ہو تو اسلام وطن سے ایسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محبت کی مخالفت بھی نہیں کرتا ہے۔ ہندوستان و پاکستان ایشیا کے ممالک میں سے دو ملک ہیں۔ پہلے یہ دونوں ایک تھے۔ جغرافیائی حیثیت سے اب یہ دو الگ الگ ملک ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے سربراہوں کو چاہیے کہ لڑائی کے بجائے گفت و شنید کے ذریعے اپنے متنازعہ مسائل خود حل کریں۔ یوروپ، روس اور امریکہ کے دست نگر اور محتاج نہ بنیں۔ قرآن عظیم میں ہے کہ وَالصُّلْحُ خَیْرٌ۔ صلح بہتر چیز ہے۔"[1]

حضرت مولاناؒ کی یہ بیباکانہ تقریر آج بھی اسی طرح مفید ہے جس طرح کہ ۱۹۶۵ء میں تھی۔

علمی مقام:

مولانا ایک بلند پایہ محدث، مفسر اور فقیہہ تھے۔ علم حدیث میں آپ نہ صرف ایک بہت بڑے محدث اور علامۃ العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے بلکہ خود بھی اونچے درجہ کے محدث تھے۔ آپ نے شوال ۱۳۲۹ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۲۸ رجب ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں حدیث شریف کی تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی۔[2] یہ سند بہت مشہور ہے رامپور میں بھی آپ نے کتب حدیث کی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی تھی چنانچہ آپ کو حضرت حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ اور ان سے شیخ حضرت مولانا شاہ وزیر محمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے[3]

---

[1] مولانا سردار شاہ خاں، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۴۳، ۲۴۴
[2] مولانا سردار شاہ خاں صاحب قادری وجیہی، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۳۰
[3] ایضاً، ص ۲۳۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت مولاناؒ اپنے تلامذہ کو حضرت مولانا حافظ شاہ وزیر احمد صاحبؒ محدث رامپوری کے توسط سے مندرجہ ذیل سند بھی مرحمت فرماتے تھے: حضرت مولانا حافظ شاہ وجیہہ الدین احمد خاں صاحب عن حضرت مولانا حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا سید حسن شاہ صاحب محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا شاہ سید عالم علی صاحب نگینوی محدث مرادآبادیؒ عن حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلویؒ عن حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ عن سراج المحدثین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ[۱] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ سے یہ سلسلۂ حدیث سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب نے طویل عرصہ تک مختلف مدارس میں درس حدیث دیا۔ ایک مرتبہ راقم السطور سے خود فرمایا کہ میں نے ساٹھ (۶۰) سال سے زیادہ درس حدیث دیا ہے۔ یہ مدت قمری (ہجری) سنہ کے اعتبار سے فرمائی تھی۔ کتاب "حالات مشائخ" سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ریاست دادوں ضلع علی گڑھ کے مدرسہ حافظیہ سعیدیہ سے ہی مسلم شریف پڑھانا شروع کر دی تھی۔[۲] یہ ملازمت غالباً سنہ ۱۳۴۳ھ سے شروع کی تھی اس طرح ساٹھ سال کی مدت سنہ ۱۴۰۳ھ میں مکمل ہو جاتی ہے۔ حضرت مولاناؒ نے مجھ سے مندرجہ بالا مدت سنہ ۱۴۰۳ھ کے بعد ہی کسی تاریخ میں بتائی ہے۔ مولانا کا درس بخاری ایک خاص انداز کا

۱۔ مولانا سردار شاہ خاں صاحب قادری وجیہی، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۳۰

۲۔ ایضاً، ص ۲۳۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا تھا جس میں آپ اکابر محدثین کے طرز پر احادیث کی شرح کے ساتھ ساتھ ضرورت پڑنے پر حنفی نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کرتے تھے۔ راقم السطور کو اتفاقاً کئی بار مدرسہ فرقانیہ میں مولانا کے درس بخاری میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

اصول حدیث پر ایک کتاب "حدیثی اصول" مولانا کی اس فن میں گہری بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ اردو میں اصول حدیث پر یہ کتاب ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے جس میں جگہ جگہ مولانا نے اصول حدیث کے سلسلہ میں ائمہ کے اختلافات سے بھی بحث کی ہے۔ مثلاً حدیث مرسل کے مقبول و ناقابل قبول ہونے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر مرسل کی عادت ثقات اور غیر ثقات کل کے حذف کرنے کی ہے تو باتفاق ائمہ مجتہدین قابل قبول نہیں، اور اگر محض ثقات راوی کو حذف کرتا ہے، تب بھی جمہور محدثین توقف کے قائل ہیں۔ اس لیے احتمال ہے کہ شاید محذوف راوی ضعیف ہو۔ اور یہی امام احمدؒ کا ایک قول ہے۔ شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "کہ اگر حدیث مرسل کی تائید کسی دوسری حدیث سے ہو جائے خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو مرسل مانی جائے گی، ورنہ توقف کیا جائے گا" لیکن امام احمدؒ کا قول ثانی اور امام مالکؒ اور امام اعظمؒ بلکہ جملہ کوفیین کا مذہب یہ ہے کہ بغیر کسی تائید کے بھی مرسل قابل قبول ہے۔ یہی مذہب اشبہ بالحق ہے چونکہ جمہور کا یہ احتمال کہ ممکن ہے محذوف راوی ضعیف ہو، اس وقت قابل اعتبار ہو سکتا ہے کہ ہم ثقہ راوی کی مرسل میں قید نہ لگائے ہوں۔[۱]

---

[۱] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، حدیثی اصول، رامپور، ص ۳۰-۳۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر ہے کہ ثقہ وہی ہو گا جو غیر ثقہ کو نہ چھپائے۔ مرسل کی ثقاہت خود محذوف کی ثقاہت کی دلیل ہے۔" [1]

حدیث میں ناسخ و منسوخ کی بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"...... یہ تفصیل تعارض سے متعلق مذہب شافعیؒ کی بنا پر تھی اب ہم حنفیہ کے مطابق تفصیل بیان کرتے ہیں۔ حنفیہ کا قول ہے کہ اول نسخ ہے پھر ترجیح پھر توفیق پھر توقف۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حنفیہ نے توفیق کو مذہب شافعی کے مطابق کیوں مقدم نہیں کیا، اس لیے توفیق کی صورت میں دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے گا، اور نسخ کی صورت میں صرف ایک پر۔

حضرت استاذی مولانا شاہ محمد انور صاحب مدظلہ العالی نے اس طرح جواب دیا ہے کہ: "ہمارے امام کا قول حق ہے، اس لیے کہ نسخ سے مراد وہ نسخ ہے جو بطریقہ نقل ثابت ہوا اور جہاں ہم کو نقل مجبور کرتی ہے کہ ایک حدیث ناسخ ہے اور دوسری منسوخ، پھر بھی توفیق کی طرف رجوع کرنا تو ایسا ہے کہ جیسے ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ درحقیقت اسلام یہودیت اور نصرانیت کا ناسخ ہے پھر بھی ہم توفیق کے طالب بن کر فروعات میں اتحاد تلاش کریں۔" [2]

اصح الاسانید پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بعض اسانید کے متعلق اصح الاسانید ہونے کا قول کہا گیا ہے۔ احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ سند "زہری عن سالم بن عبداللہ

---

[1] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، حدیثی اصول، رامپور، ص ۳۰، ۳۱

[2] ایضاً، ص ۵۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بن عمر عن ابیہ "، کو اصح الاسانید کہتے ہیں۔ علی المدینیؒ "سند — "محمد بن سیرین عن عبیدۃ بن عمر عن علی"، کو اصح کہتے ہیں۔ یحییٰ بن معینؒ اور امام نسائیؒ "سند — "ابراہیم النخعی عن علقمہ عن ابن مسعود" کو اصح کہتے ہیں۔ بخاریؒ "سند — "مالک عن نافع عن ابن عمر" کو اصح کہتے ہیں۔ ابوبکر بن شیبہؒ "سند — "زہری عن علی بن الحسن عن ابیہ عن علی"، کو اصح کہتے ہیں۔

لیکن قول مختار یہ ہے کہ کسی خاص سند پر مطلقاً اصحیت کا اطلاق کرنا اور جملہ اسانید کو ہر طرح اس کو حکم کر دینا مناسب نہیں۔ اور یہ جس کی تفصیل ہم ائمہ کرام مذکورین سے بعض اسانید کی اصحیت کے متعلق نقل کر چکے ہیں، بعض امورات کو مدّنظر رکھ کر اصحیت جزئیہ کا حکم لگایا گیا ہے ہاں جس کی اصحیت کے متعلق ائمہ سے صراحت آچکی ہے وہ ضرور ...... ان طرق سے اعلیٰ ہیں جن پر کسی نے آج تک اصحیت کی یا مخصوص تصریح نہیں کی ...."[1]

اس طرح اس کتاب میں مولانا نے بڑی خوبی سے اصول حدیث میں اختلاف ائمہ کو بھی جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب غالباً ۱۳۲۴ھ میں لکھی گئی تھی کیونکہ مولانا محبوب علی صاحب (پرنسپل جامع العلوم فرقانیہ، رامپور) کے مطابق یہ کتاب تصنیف کرنے کے تقریباً ۵۸ سال بعد[2] پہلی بار ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ (مطابق ستمبر ۱۹۸۲ء) میں طبع ہوئی۔ کتاب کا یہی اڈیشن اس وقت ہمارے پاس ہے۔

---

[1] ایضاً، ص ۷۹، ۸۰

[2] ملاحظہ ہو: "تعارف"، کتاب ہذا، ص ۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب نہ صرف ایک بلند پایہ محدث تھے بلکہ ایک مفسر بھی تھے۔ "انہے مواعظ و تقاریر میں قرآنی آیات کی ایسی جچتی ہوئی تفسیر فرماتے تھے جس سے آپ کی جلالت علم کا اندازہ ہوسکتا تھا۔" جس زمانے میں آپ کا ریاست دادوں ضلع علی گڑھ میں قیام تھا اور وہاں پر مدرسہ حافظیہ سعیدیہ میں مسند نشین درس تھے تو اس زمانہ میں رئیس اعظم دادوں نواب ابوبکر خاں صاحب نے ایک روز آپ سے آیت کریمہ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ کی تشریح کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے اس پر کافی دیر تک تقریر فرمائی۔ دوسرے روز نواب صاحب موصوف نے پھر یہی آیت کریمہ پیش کی۔ آپ نے پھر اس موضوع پر بڑی طولانی تقریر کی تیسرے روز پھر نواب صاحب موصوف نے اسی آیت کریمہ کو تقریر کا موضوع قرار دیا۔ آپ نے تیسرے روز ایسی جامع اور بصیرت افروز تقریر فرمائی جس سے نواب صاحب موصوف کا قلب مطمئن ہو گیا ہے[۱]

اصول تفسیر کے موضوع پر مولانا کی ایک تصنیف "مقدمۃ القرآن یعنی تفسیر اصول" کے نام سے ہے۔ اس میں مولانا نے فہم قرآن، تفسیر قرآن کے طریقے، اسرائیلیات ورقرآن، ترتیب سور اور سائنس اور قرآن جیسے مضامین سے بحث کی ہے۔ فہم قرآن کے سلسلے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں :-

"قرآن عظیم کو چند مقامات پر "کتابٌ مُّبین"، یعنی کھلی ہوئی کتاب کہا گیا ہے، اس لفظ سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ "قرآن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کی اعانت درکار نہیں ہے۔" اس غلط فہمی سے بہت سے نتائج بد پیدا ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ہم بھی

۱۔ ا سردار خاں صاحب، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۴۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بات کے قائل ہیں کہ فی الواقع "قرآن کھلی ہوئی کتاب ہے" لیکن اس کے مراتب ہیں۔ جو شخص علوم عربیہ اور لسان عرب سے واقف نہیں وہ کسی ایک جملہ کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ کیا کوئی صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ غیر عربی داں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کا ترجمہ سمجھ سکتا ہے؟ اگر نہیں سمجھ سکتا، اور یقیناً نہیں سمجھ سکتا تو اس کے حق میں قرآن کھلی ہوئی کتاب کہاں ہوئی؟ اس لیے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ عربی زبان سے جو واقف ہے؛ اس کے لیے قرآن عظیم کھلی ہوئی کتاب ہے اور جو اس سے واقف نہیں؛ اس کے لیے کھلی ہوئی کتاب نہیں۔ اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہے لیکن تاریخ اسلام اس کے پیش نظر نہیں تو تاریخی واقعات میں اُس کا فیصلہ کرنا کہ فلاں بیان واقعہ کی ابتدا ہے، یا انتہا، یا درمیان؛ اس کے لیے ناممکن ہے۔" [1]

دوسری طرف مفسر کے لیے عربی زبان کے علاوہ دیگر علوم میں مہارت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"........ اگر کسی نے ظاہری عربی دانی کی بناء پر کسی سورت کی ایک تفسیر کر دی لیکن قوی حدیث اس کے خلاف ہے تو کیا صحیح حدیث مفید رہے گی یا اس کی ذاتی رائے؟ بعض مقامات پر حضورؐ سے کوئی روایت دستیاب نہیں ہوئی ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آیات فرقانیہ کی تفسیریں منقول ہوئی ہیں۔ ایسے مقامات پر اقوال صحابہؓ اور اعمال صحابہؓ سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر

---

[1] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں: مقدمۃ القرآن یعنی تفسیری اصول، رامپور، ص ۲۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صحابہؓ علیہم الرضوان کے اقوال مختلف ہوتے ہیں، وہاں ایک قول کو ترجیح دینے کے لیے قوت اجتہاد اور ملکۂ استنباط کی ضرورت ہے جو ہر مسلمان میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر عالم میں بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اہم ضرورت ہے کہ مفسّر اصولِ تفسیر سے واقف ہو یا کسی کا مقلد ہو۔۔۔“[1]

اسرائیلیات اور قرآن کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے تحریر کیا ہے:

”۔۔۔۔۔۔ہاں بنی اسرائیل میں سے ارباب علم جب اسلام میں داخل ہو گئے اور ان کی بات قابل پذیرائی ہو گئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

حَدِّثُوا عن بنی اسرائیل — بنی اسرائیل سے واقعات نقل کرو

ولا حرج — اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء اہل اسلام کا فیصلہ یہ قرار پایا کہ پہلے قرآن وحدیث اور مسلّمہ کلیات و اصول پر نظر کی جائے اس کے بعد اسرائیلیات پر نظر کی جائے۔ اگر سابقہ یقینیات کے خلاف نہ ہوں تو مان لیا جائے ورنہ نظرانداز کر دینا ضروری ہے۔“[2]

مولانا دیگر مستند اور جدید مفسّرین کی طرح اسرائیلیات میں سے ہر قسم کی روایات نقل کرنے کے مخالف تھے البتہ وہ قابل اعتبار روایات جو کہ کسی قرآنی واقعہ کی تاریخی تشریح کرتی ہیں بشرطیکہ شریعت کے اصول کے منافی نہ ہوں قبول کر لینے میں مضائقہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مزید تحریر کرتے ہیں!۔

---

[1] ایضاً۔ ص ۲۸

[2] ایضاً۔ ص ۵۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"...... الغرض اسرائیلیات سے مفر بھی نہیں، اور ہر چیز کو معتبر سمجھ لینا بھی درست نہیں۔ اس امتیاز کے لیے استعداد علمی اور فراہمی معلومات دینیہ کی بے حد ضرورت ہے"۔ ؎[1]

سائنس اور قرآن کے موضوع پر مولانا نے اپنی اس کتاب میں اچھی بحث کی ہے فلسفیانہ خیالات اور سائنسی تحقیقات کو اسی حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ شریعت کے تحت ہوں۔ چونکہ انسانی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں اس لیے اگر کوئی تحقیق شریعت سے متضاد ہوگی تو اسلام میں وہ قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ اس ضمن میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"...... دوسری بات اسلام میں یہ ضروری ہے کہ علمی تحقیقات کو قطعی اور یقینی عقائد پر ترجیح نہ دی جائے۔ طریقۂ سلامتی یہ ہے کہ جہاں عقل پورا فیصلہ نہ کر سکے اور پورا علم نہ ہو سکے، وہاں خاموشی اختیار کرکے یہ کہہ دے کہ "اللہ جانے"۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے من العلم ان تقول لما لا تعلم "اللہ اعلم"۔ یہ علم کی بات ہے کہ جو نہ جانتا ہو اس کے متعلق یہ کہہ دے کہ "واللہ اعلم"

بڑے بڑے اکابر اسلام نے اسی حدیث پر نظر کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے سوال کیا گیا کہ "دہر کیا چیز ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "لا ادری" (میں نہیں جانتا) حضرت امام مالکؒ سے چالیس مسئلے دریافت کیے گئے۔ ۴ کا جواب دیا اور ۳۶ میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہ حضرات اپنے زمانے میں دین کے

؎[1] ایضاً ص ۵۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے چراغ تھے جن کی روشنی اب تک باقی ہے۔ کیا ایسے حالات میں اس وقت کے کم مایہ مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر چیز کے فیصلہ کے لیے تیار رہو اور بعض اوقات قطعی اور یقینی امور کا اس لیے انکار کر دے کہ ماحول اور وقت اس کے خلاف ہے۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ساز

الغرض مدعا یہ ہے کہ عوام تو سنی سنائی باتوں کے لیے ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے فلسفی تحقیقات پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مسلمان کو غور کرنا چاہیئے۔ فلسفہ قدیم ہو یا جدید ہمارے یقینی مسائل کی کس قدر موافقت کرتا ہے اور کہاں کہاں مخالفت۔ موافق ہونے کی صورت میں تو "چشم ما روشن و دل ما شاد"۔ مخالفت کی صورت میں یہ کہنا ضروری ہے کہ انسانی علم بہت محدود ہے اور عقل کو ہر مقام پر دوڑانا عاقل کا کام نہیں۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن"[1]

مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب اور تصوف:

حضرت مولاناؒ سلسلہ قادریہ نقشبندیہ مجددیہ میں ایک صاحب نسبت شیخ تھے۔ ویسے تو مولاناؒ کو بتوصل حضرت مجدد الف ثانی سلاسل اربعہ یعنی چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ میں اجازت حاصل تھی لیکن آپ ذکر و اشغال قادریہ مجددیہ سلسلے کے کراتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ تک حضرت مولاناؒ[7] کا شجرہ اس طرح ہے: حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب از شاہ ممتاز

---

[1] ایضاً، ص ۵۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حسینیؒ از مولانا شاہ وزیر محمد خاں صاحبؒ از شاہ خواجہ خان محمد خاں صاحبؒ از شاہ احمد علی خاں صاحبؒ از شاہ سلطان امام الدین خاں صاحبؒ از شاہ درگاہی محبوب الٰہیؒ از حافظ شاہ سید جمال اللہ صاحبؒ از شاہ قطب الدین سید محمد اشرف حمد رحسینیؒ از خواجہ محمد زبیر مجددی سرہندیؒ از خواجہ محمد نقشبند مجددی سرہندیؒ از خواجہ محمد معصوم مجددی سرہندیؒ از امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ الخ (نوٹ: حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اوپر اس سلسلے و دیگر سلاسل کے شجرے معروف ہیں وہ کسی بھی ایسی کتاب سے دیکھے جا سکتے ہیں جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلاسل کی تفصیل ہو۔ حضرت مولانا وحید الدین احمد خاں صاحبؒ نے بھی اپنی تصنیف "فیوضات وزیریہ" میں یہ تفاصیل لکھی ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۲۹۷ تا ص ۳۰۴)

تصوف کے موضوع پر حضرت مولاناؒ کی ایک کتاب "فیوضات وزیریہ" ہے اس میں آپ نے تصوف کی اصطلاحات و دیگر امور بہت سہل انداز میں سمجھائے ہیں۔ بیعت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> "ایک بیعت" علی الاسلام" ہے۔ غیر مسلم نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبارت اور مقدس ہاتھوں پر یا کسی اور بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں۔
>
> دوسری "بیعت علی الہجرت" ہے۔ جو انصار نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست مبارک پر کی تھی، کہ ہم اپنے شہر مدینہ میں آپ کو لے جا کر آرام سے رکھیں گے، اور جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طریقہ سے آپ کی بھی حفاظت کریں گے، اور جو مہاجرین جائیں گے، ان کی جانی و مالی خدمت سے دریغ نہیں کریں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیسری "بیعت علی الجہاد" ہے۔ مختلف مواقع پر جب غزوات اور جہاد کی ضرورت پیش آتی تھی تو حضور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لیا کرتے تھے، کہ ہم مرجائیں گے مگر راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

چوتھی "بیعت علی الخلافت" ہے۔ جو حضور سید الاولین والآخرین رحمۃ اللعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم یعنی سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ، کے مبارک ہاتھوں پر بیعتیں کی گئیں۔ اور اسی طرح دوسرے حق پرست خلفاء کے ہاتھوں پر بھی بیعتیں ہوتی رہیں۔

پانچویں "بیعت علی الخیر" ہے۔ مسلم شریف میں حدیث مبارک ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے فرمایا، نہ جہاد تھا، نہ ہجرت تھی نہ اسلام میں داخلی تھی لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لی اور ارشاد فرمایا، "دیکھو ہم خیر کے کام کریں گے"۔

مشائخ کرام میں جو بیعت رائج ہے وہ یہی "بیعت علی الخیر" ہے بیعت ایک معاہدہ ہے بندہ اور خدائے تعالیٰ کے درمیان ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ حضرات صوفیہ "بیعت علی الخیر" لے کر اپنے متوسلین کو انھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اوراد و وظائف کی تلقین فرماتے ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو تلقین فرمائے تھے۔۔۔۔۔۔۔" [1]

اپنی اس کتاب میں حضرت مولاناؒ نے گاہ بگاہ متقدمین مشائخ کے کلام کو بطور سند پیش کیا ہے۔ سلوک اور اس کی اہمیت نیز سیر و سلوک کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی تحریر بطور تائید پیش کی ہے:

"۔۔۔۔۔۔ اور سیر آفاقی کے تمام ہونے کے بعد سیر انفسی میں جس سے مراد سفر در وطن ہے، آرام دیتے ہیں۔

هَنِيئًا لِأَرْبابِ النعيم نعيمها

اس دولت عظمیٰ تک پہنچنا سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے وابستہ ہے۔ جب تک اپنے آپ کو پورے طور پر شریعت میں گم نہ کر دیں، اور اوامر کے بجالانے اور نواہی کے رک جانے سے آراستہ نہ ہو جائیں، اس دولت کی بو جان و دماغ میں نہیں پہنچتی۔ باوجود شریعت کی مخالفت کے اگرچہ بال برابر ہی ہو، اگر بالفرض احوال و مواجید حاصل ہو جائیں وہ سب استدراج میں داخل ہیں، آخر اس کو رسوا و خوار کریں گے۔

محبوب رب العالمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کے بغیر خلاصی ممکن نہیں۔" (مکتوب نمبر ۸۷، دفتر اول حصہ اول)" [2]

---

[1] مولانا وجیہ الدین احمد خاں' فیوضات وزیریہ' رامپور' ص ۲۹، ۱۰۰، ۱۰۱

[2] مولانا وجیہ الدین احمد خاں، ایضاً، ص ۱۱۸، ۱۱۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولاناؒ نے تصوف کے دقیق مسائل کو بھی بڑے سہل انداز میں بیان فرمایا ہے س سے ایک عام فہم مسلمان بھی استفادہ کر سکتا ہے۔ لطائف کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"لطائف خمسہ کی اصلاح کے لیے حضرات نقشبندیہ تدریجی طور پر ہر ایک لطیفہ کا ذکر اور اس کی اصلاح کراتے ہیں۔

غوث زماں قطب عالم مروج شریعت مصطفٰے قیم طریقۂ مجتبےٰ سلطان الاولیاء قطب ارشاد حضرت حافظ شاہ جمال اللہ قدس سرہٗ الاقدس کے یہاں لطیفۂ قلب کی اصلاح کے ساتھ ساتھ باقی تمام لطائف کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور یہی حدیث شریف کے مطابق ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے إنّ فی الجسد لمضغۃً اذا صلحت صلح الجسد کلّہ واذا فسدت فسد الجسد کلّہ الا وھی القلب"

فرمان گرامی کا مطلب یہ ہے کہ: جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو پورا جسم درست ہو جائے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جائے، آگاہ ہو جاؤ وہ دل ہے"...... [1]

موضوع سماع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی شخص کا اشعار سننا جس سے ذوق و شوق میں اضافہ ہو سماع کہلاتا ہے۔ اشعار پڑھنے کے طریقے کبھی متعدد ہوتے ہیں، اور کبھی ایک کبھی یہ پڑھنے والے مزامیر کا استعمال کرتے ہیں اور کبھی بلا مزامیر

---

[1] ایضاً، ص ۱۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عام طور پر متعدد افراد مع مزامیر یہ کام کرتے ہیں (اس) اسی کو سماع اور قوالی کہتے ہیں۔ ایک شخص اچھی آواز اور اچھے ترنم سے اشعار پڑھے اور وہ پوری طرح باشرع ہو، اشعار بھی لغو اور بیہودہ نہ ہوں، نیز اس کے ساتھ مزامیر بھی نہ ہوں تو اس میں کسی کے نزدیک کوئی حرج نہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اشعار مسجد میں پڑھوائے ہیں، بلکہ ان کے لیے منبر بھی بچھوایا ہے، خود بھی حضورؐ نے سنے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی سنوائے ہیں۔ حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اشعار میں ثنائے باری تعالیٰ، نعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تعریف اسلام اور مدح قرآن ہوتی تھی ....

....

....

ہاں ایک یا چند افراد مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھیں تو جمہور علمائے کرامؒ کے نزدیک یہ ممنوع ہے ....

....

حنفیہ کا منصب ہے کہ وہ جمہور احنافؒ کا قول دیکھیں۔ جمہور احنافؒ نے مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

حضرات صوفیہ کرام میں بھی اختلاف ہے۔ حضرات چشتیہ اس کے جواز کی طرف عموماً رجحان رکھتے ہیں، لیکن جواز کے لیے جو شرائط مشائخ چشت کی کتابوں میں مذکور ہیں وہ اس زمانے میں عموماً مفقود ہیں۔

[redacted]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لیے تصوف اور چشتیت کی آڑ لیکر ذکر قوالی کے نام کے ساتھ گانا سننا مزامیر کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں۔۔۔۔۔" سلہ

"وحدۃ الوجود" اور "وحدۃ الشہود" تصوف کے دقیق ترین مسائل میں سے ہیں۔عوام تو عوام بعض علماء کی بھی رسائی ان تک نہیں ہو پاتی۔ اس لیے اکابر صوفیا کا مسلک یہ ہے کہ ان مسائل کی تفصیلات میں عقل نہیں لڑائی جائے بلکہ سالک اگر کسی واصل باللہ شیخ کی رہنمائی میں سلوک طے کر رہا ہے تو اس حال پر پہنچنے پر اس کو خود بخود اس کی حقیقت کھل جائے گی۔حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب رح بھی اسی مسلک پر تھے۔چنانچہ "وحدۃ الوجود" اور "وحدۃ الشہود" پر مختصر آ تعارفی سطور تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ہم لوگ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے مبارک سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تحقیق اس مسئلہ میں یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اس کی مخلوق میں تباین ہے۔بندہ خدا رسیدہ ہو سکتا ہے، حقیقۃً خدا نہیں ہو سکتا اور یہی قول جمہور حضرات علمائے کرام کا بھی ہے۔عام طور پر حضراتِ علمائے کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ بندہ نہ ذاتِ خداوند قدوس کے ساتھ متحد ہے، اور نہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود سے متحد ہے، بلکہ اس کی حقیقت اور وجود اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے حضرات مرشدین طریقہ عالیہ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ جب کسی پر حال طاری ہوگا تو وہ خود سمجھ لے گا اور حال طاری نہ ہو تو بندہ کو

سلہ ایضاً، ص ۱۳۰ تا ۱۳۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمیشہ یہی اقرار کرنا چاہیئے کہ میں بندہ عاجز ہوں اور اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق۔ میں جاہل ہوں اور اللہ تعالیٰ عَالِمُ الغیب وَ الشہادۃ میں فانی ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا میری ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ اللہ تعالیٰ کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ اللہ تعالیٰ ازلی ہے اور ابدی کسی چیز میں کسی وقت بھی کسی کا اللہ تعالیٰ محتاج نہیں۔ اور ہم بندگان قدم قدم پر ہر وقت اور ہر چیز میں اس کے محتاج ہیں۔

اور جو شخص عاجزی اور انکساری اختیار کرے گا اور تواضع سے کام لے گا تو اللہ تعالیٰ جل شانہ‘ وعم نوالہ‘ اسے عروج اور بلندیاں مرحمت فرمائے گا۔ دنیا کی بلندیاں کسی شکل میں بھی ہوں، پانی کے بلبلے کی طرح ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

لہٰذا اہل سلسلہ اس مسئلہ میں جو کہ انتہائی دقیق و عمیق مسئلہ ہے، ہرگز نہ الجھیں اور نہ بحث و مباحثہ کریں۔ ورنہ ایمان کا خطرہ ہے[۵]"

مولاناؒ نے اس کتاب میں تصوف اور صوفیا کے متعلق اکابر مشائخ کے اقوال اور خیالات نقل کیے ہیں بعد میں بطور محاکمہ اپنی رائے درج کرتے ہیں:

"ان الفاظ کی تشریح و توضیح میں تفاوت بظاہر معلوم ہوتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ مقصد و مدعا سب حضرات صوفیہ رحمۃ اللہ علیہم کا ایک ہی ہے۔ یعنی تصوف نام ہے، قولاً، فعلاً، حالاً ہر حال میں اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، اور اسی پر ہمیشہ کاربند رہنے کا۔ جب حضرات

---

[۵] ایضاً، ص ۱۳۴، ۱۳۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صوفیہ بر حق رحمۃ اللہ علیہم کے نفوس مقدس دمنور ہو جاتے ہیں، حجابات دور ہو جاتے ہیں اور ہر چیز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ اتباع کرنے لگتے ہیں تو ایسی حالت میں اللہ جل شانہ وعم نوالہٗ کا ان پر خاص کرم ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

(اے رسول) کہہ دیجیے کہ اگر خدا کو دوست رکھو گے، تو میری اتباع کرو، خدا تم سے محبت کرنے لگے گا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت حقیقت میں محبت الٰہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا صلہ ہی محبت خداوندی قرار دیا گیا ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے:

فَاَوْفَرُ النَّاسِ حَظًّا مِّنْ مُتَابَعَةِ الرَّسُوْلِ اَوْفَرُهُمْ حَظًّا مِّنْ مَحَبَّةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالصُّوْفِيَّةِ مِنْ بَيْنِ طَوَائِفِ الْاِسْلَامِ ظَفَرُوْا بِحُسْنِ الْمُتَابَعَةِ۔

ترجمہ: "پس جو شخص جتنا زائد متبع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی قدر زائد وہ محبت الٰہی کا بھی حصہ دار ہے، اور تمام اسلامی گروہوں میں صوفیہ ہی نے سب سے زیادہ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہے۔" (عوارف المعارف ص۲۶)[1]

---

[1] ایضاً، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طرح حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ نے اپنی کتاب "فیوضاتِ وزیریہ" میں اکابر مشائخ و صوفیاء کے طرز پر تصوف اور اس کے متعلقات کی وضاحت کی ہے اور اُسی تصوف کو رائج قرار دیا ہے جو شریعت کی پابندی کے ساتھ اور شریعت کے تحت ہو۔ غیر شرعی امور کو تصوف سے خارج قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب نے زیادہ تصانیف نہیں چھوڑی ہیں کیونکہ انھوں نے اپنا وقت درس و تدریس اور وعظ و نصیحت میں زیادہ گزارا۔ اگر حضرت مولاناؒ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دیتے تو یقیناً اس دور کے ایک بڑے مصنف ہوتے۔ مندرجہ بالا سطور سے مولانا کی علمی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولاناؒ نے اس دور میں رامپور کے مسلمانوں کی بالخصوص اور عامتہ المسلمین کی بالعموم جس طرح خدمت کی اور دینی امور میں رہنمائی کی وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

© rasailojaraid.com